محمد حنیف ندوی

تاثرات

(۲)

مولانا احتشام الحق اور عائلی کمیشن۔ عائلی کمیشن کے ارکان اور مولانا احتشام الحق میں جو اختلاف رائے ہے۔ اس کا تعلق دراصل مسائل و سفارشات کے صحیح یا غلط ہونے سے نہیں ہے۔ بلکہ ذہن و فکر کے اختلاف سے ہے۔ مولانا اس گروہ سے وابستہ ہیں جو مذہب و زندگی کے بارہ میں سطحی اور اتھلی معلومات کی بنا پر کوئی رائے قائم کر لیتا ہے اور پھر اس میں کوئی تغیر اور تبدیلی گوارا نہیں کرتا۔ جو مذہب کو چند جزئیات کی تفصیل و توضیح تک محدود سمجھتا ہے۔ اور حیاتِ انسانی کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اس میں کوئی تغیر رونما ہونے والا نہیں۔ اور دوسرے اراکین ایسے مدرسۂ خیال کو تسلیم کرنے والے ہیں جو مذہب کو ساکن و جامد نہیں مانتا، اور نہ زندگی کی بوقلمونیوں کا منکر ہے۔ بلکہ جس کا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام قیامت کے لئے نوعِ انسانی کے حق میں خیر و برکت کا پیغام رہیگا۔ اور جب تک کہ اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی کے کسی حد تک امکانات موجود ہیں، اس وقت تک اس کی فیض رسانیوں میں فرق آنے والا نہیں۔ دوسرے لفظوں میں جس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ یہ گروہ نہ اس بات کا قائل ہے کہ مذہب جس اور غیر حرکت پذیر ہے اور اس کو مانتے ہوئے ارتقاء و تغیر کے فطری تقاضوں کا ساتھ دینا ناممکن ہے اور نہ اس چیز پر ایمان رکھتا ہے، کہ اس کارگاہِ حیات میں جدّت و اختراع کارفرما نہیں ہے اور یہ اُسی نہج و انداز پر قائم ہے کہ جس پر اوّل روز سے اس کو قائم کر دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس یہ گروہ یہ یقین رکھتا ہے کہ زندگی شروع ہی سے ایک رواں دواں حقیقت کا نام ہے، اور مذہب میں ہمیشہ سے اتنی لچک اور وسعت پائی جاتی ہے کہ وہ نت نئے پیش آنے والے حالات کا کامیابی کے ساتھ سامنا کر سکے اور بتا سکے کہ ان کے مقابلہ میں اس کا متعین موقف کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں ذہنوں میں بیّن اختلاف ہے۔ اور ان دونوں گروہوں کے اندازِ فکر میں واضح فرق ہے۔

کمیشن کے فاضل دیباچہ نگار فقہ و اجتہاد کی ضرورت و اہمیّت پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

"قرآن کریم اور حدیث رسول اپنے زمانہ نزول کے پیدا شدہ واقعات اور پیش آمدہ سوالات کی ترجمانی اور تصویر ہے۔ اور چونکہ ہر دور اور ہر زمانہ کے انسانی مراسم اور واقعات کی مختلف نوعیتوں کا اندازہ لگانا کسی کے بس کی بات نہیں اس لئے پیغمبر اسلام نے اپنے معاصرین کے لئے قرآن و حدیث کے باوجود آزادانہ قانون سازی اور

عدالت پروازی کا ایک بڑا وسیع میدان چھوڑا ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے اجتہاد کی جس پر قرآن وسنت کے دائرہ میں رہکر عمل کیا جاتا ہے۔" اس میں حضرت معاذ کے اس قصہ کی طرف اشارہ ہے کہ جس میں خود آں حضرت نے اس حقیقت کی وضاحت فرمادی تھی کہ قرآن کی جامعیت واکملیت کے باوجود ایسے مسائل اُبھر سکتے ہیں کہ جو اس میں مذکور نہ ہوں۔ بتاؤ! ایسی صورت میں تم معاملات کو کیونکر نمٹاؤ گے۔ پھر اس امر کو بھی کھول کر بیان فرمادیا تھا کہ ایسے مواقع بھی پیش آسکتے ہیں کہ جب میری سنت میں بھی تمہیں کوئی متعین رہنمائی میسر نہ ہو۔ اگر یہ حالات پیش آئیں تو تمہارا طرزِ عمل کیا ہوگا۔ حضرت معاذ نے جب یہ فرمایا کہ ایسی صورت میں میں فکر ورائے سے کام لوں گا، تو آپ نے اطمینان کا اظہار کیا۔ یہ صحیح حدیث ہے اور خود مولانا نے اس کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مولانا کی نظر سے اگر اصول کی اونچی کتابیں گذری ہیں تو انہیں اچھی طرح معلوم ہونا چاہیئے کہ خود ائمہ اصول فقہ نے بھی جب فقہ واجتہاد کی ضرورت پر بحث کی ہے تو اسی حدیث کو استدلال کا مدار و محور قرار دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چشمِ نبوت نے عین اس وقت جب کہ ابھی جبریل امین کی آمدورفت ختم نہیں ہوئی تھی اور عین ایسے حالات میں جب کہ دین کی ایک ایک گرہ کھل رہی تھی اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا کہ قرآن صرف بنیادی اور ضروری حقائق کو بیان کرتا ہے، اور یا پھر ایسی جزئیات پر روشنی ڈالتا ہے کہ جن کا تعلق کسی خاص بنیادی مسئلہ کی تاریخی وقدرتی ترتیب سے ہے۔ اور اس کے فرائض میں یہ ہرگز داخل نہیں کہ ان تمام جزئیات کا استیعاب کے ساتھ ذکر کرے جو آئندہ چل کر ظہور پذیر ہونے والی ہیں۔ اسی طرح پیغمبر کی بصیرت دینی سے یہ بات بھی اوجھل نہیں تھی۔ کہ خود میرا اُسوہ ونمونہ، میری احادیث اور سنن اور طریقِ حیات ان بنیادی حقائق کی تشریح وتوضیح سے تعبیر ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ موجودہ معاشرہ، اور معاشرہ کی موجودہ ترتیب اسی طرح قائم رہنے والی ہے اور اس میں کسی تغیّر وتبدّل کے رونما ہونے کی توقع نہیں۔ یا کہ مستقبل قریب یا بعید میں نئے نئے تقاضے مسائل کے لئے نئے نئے قالب اور سانچوں کا مطالبہ نہیں کرینگے۔ اس بنا پر ضروری سمجھا کہ نزول قرآن کے زمانہ ہی میں اس امر کی تصریح کردی جائے کہ زندگی کی حقیقتیں نت نیا روپ اختیار کرنے والی ہیں۔ اور حالات و ظروف کی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ اس لئے اس میں کوئی اشکال اور استبعاد نہیں کہ ایک شخص دیانت داری کے ساتھ ایسے مسائل سے دوچار ہو جن کا واضح اور صاف جواب ان کے الفاظ میں نہ مل سکے۔ یا ایسی پیچیدگیوں کا سامنا کرے، کہ جن کو احادیث کی روشنی میں سلجھانا ممکن نہ ہو۔ اس صورت میں اسلام نے فکر و اجتہاد اور غور وفکر کی آسانیاں مہیّا کی ہیں۔ اور حدیث معاذ اسی زرّیں اصول کی وضاحت پر مبنی ہے۔ یہاں ایک بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے۔ کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایسے مسائل پیش آسکتے ہیں کہ جن کا ذکر قرآن و حدیث میں نہ ہو۔ تو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ ایسی تصریحات نہ ہوں کہ جن سے براہِ راست ان کے

فہم میں مدد مل سکتی ہو۔اس سے قرآن وحدیث کی اس حیثیت کی نفی نہیں ہوتی کہ اس میں ایسے اصول مذکور ہیں، ایسی بنیادوں کی وضاحت کی گئی ہے اور اس طرح ہر ہر جزئی کی روح ومعنویت بیان کی گئی ہے کہ ان پر تعلیل و حکم اور استدلال واستناد کا پورا کارخانہ تعمیر ہوسکتا ہے۔

اب اس پر مولانا احتشام الحق کا اعتراض ملاحظہ ہو۔"حیرت واستعجاب کا مقام ہے کہ جو حضرات حق تعالیٰ اور اس کی شان نبوّت ورسالت اور دین کی جامعیت جیسے ابتدائی مسائل سے یکسر نابلد ہوں وہ ان موضوعات پر نہایت بے باکانہ طریقہ سے قلم اُٹھانے کی جسارت کیسے کرتے ہیں۔شاید ہمارے دیباچہ نویس کو معلوم نہیں، کہ قرآن اس ذات پاک کا کلام ہے۔اور اس کی دی ہوئی ہدایت ہے جس کو ازل سے ابد تک ہر دَور اور ہر زمانہ کے ایک جزئی واقعات کا تفصیلی علم ہے اور اس کو انسانی مراسم وتعلقات کی ان تمام گوناگوں نوعیتوں کی خبر ہے جو مستقبل کے کسی دُور زمانہ میں ظہور پذیر ہوسکتی ہیں تو اس کی طرف سے نازل کردہ قرآن یا اس کی جانب سے بھیجا ہوا رسول اور ان کی الہامی زندگی یہ سب امور اس حقیقت پر مبنی ہیں کہ قیامت تک عالم میں جس قدر واقعات کی بوقلمونیاں ظاہر ہونگی ان سب کے لئے کتاب وسنت کی تعلیمات واحکام ناطق دلیل راہ اور قولِ فیصل ہیں اور یہی اسلام کا بُنیادی عقیدہ ہے۔"

مولانا کے اس تنقیدی شاہکار میں پندار واد عا کا یہ طفلانہ انداز اوّل سے آخر تک برابر پایا جاتا ہے اور ہمیں اس پر ذرا بھی تعجب نہیں ہوا، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ احساسِ کہتری کا قدرتی نتیجہ ہے۔ان کو چونکہ کمیشن کے سامنے اپنی قابلیّت کے جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملا اور یہ کمیشن کے اراکین کو متاثر نہیں کر پائے، اس لئے اس کی کسر ادنیٰ درجہ کے طنزیہ فقروں سے نکالی جارہی ہے۔تعجب وحیرت اس پر ہے کہ تکمیل دین کا کتنا عامیانہ اور واعظانہ مفہوم ان کے ذہن میں ہے؟ یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم وادراک ہر ہر جزئیہ کو محیط ہے اور اس عالم کون وفساد میں چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں۔لیکن اس کا یہ مطلب کب ہے کہ معاشرہ میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی، حالات وظروف نہیں بدلیں گے۔اور نئے نئے مسائل انسانی ذہن کو غور وفکر کی دعوت نہیں دیں گے، یا اس کا یہ مفہوم کب ہے کہ قرآن کا یہ اصول غلط ہے کہ رشد وہدایت میں تدریج وارتقاء کے تقاضوں کا خیال رکھا جائے۔کیا قرآن تئیس برس کے طویل ترین عرصہ میں مکمل نہیں ہوا۔اور اس نے یہ فرض نہیں کیا کہ حالات کی تبدیلی وتغیّر ہی سے احکام الٰہی کی حکمتیں صحیح معنوں میں ظاہر ہوسکتی ہیں اور جب تک وہ حالات پیدا نہیں ہوجاتے اور زمانہ کی وہ کروٹیں نظر وبصر کے سامنے کھل کر نہیں آجاتیں اُس وقت تک قرآن کے بقیہ حصّہ کا نازل ہونا مناسب نہیں۔حالانکہ جب قرآن کی پہلی سورۃ نازل ہوئی ہے اور جبریل نے پہلے پہل اقراء کا مژدہ جانفزا سنایا ہے، اُسی وقت اللہ تمام چیزوں سے آگاہ اور

باخبر تھا اور اگر وہ چاہتا تو تیئس سال کا یہ طویل وقفہ و انتظار چند دنوں میں طے کر سکتا تھا۔

مولانا کو جاننا چاہیئے کہ اسلام کی تکمیل و جامعیت اور اللہ تعالےٰ کے علم کی وسعتوں ہی کا تو یہ منطقی نتیجہ ہے کہ اس نے قانون و فقہ اور آئین و اجتہاد کے بہت سے خانوں کو زمانہ کی ساز گاریوں کے لئے چھوڑ دیا ہے کہ جب جب ضرورت و تقاضا پیدا ہو اس کے مطابق تلاش و جستجو اور فکر و اجتہاد کی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جائے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسانی فہم و بصیرت کے لئے ارتقاء کی کیا گنجائش رہ جاتی قطع نظر اس کے کہ مولانا کے بیان کردہ مفہوم سے خود حدیث معاذ کی نفی ہوتی ہے ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر حالات و کیفیات کی تمام بوقلمونیاں کتاب و سنت میں تفصیل کے ساتھ آگئی ہیں تو پھر ائمہ فقہ کی علمی و فقہی کاوشوں کے لئے کیا وجہ جواز باقی رہ جاتی ہے۔ پھر امام ابو حنیفہ، شافعی، مالک و ابن حنبل اور اوزاعی و زفر یا ابو یوسف و یوطی کا مقام ہوگا۔ اور ان کی کاوشوں اور مجتہدانہ کارناموں کو کیا کہا جائے گا۔ پھر یہ مبسوط و ہدایہ کا کیا مصرف ہوگا، کتاب الام کس کام آئے گی، اور مدونہ و مغنی سے کیا کام لیا جائے گا؟

آج معاشرہ کی تبدیلیوں نے کن کن نئے مسائل کو جنم دیا ہے اور بالخصوص ہماری خانگی و عائلی زندگی کے کون کون گوشے ان تغیرات سے متاثر ہوئے ہیں ان سے تو ہم بعد میں مسائل و سفارشات کے ضمن میں تعرض کرینگے یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ تغیر و تبدل کے اس محکم اور اٹل قانون کی کارفرمائیوں کا آغاز قرن اوّل ہی میں ہو چکا تھا اور اُسی وقت یہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ بعض احکام کی پرانی ترتیب یا تو تشنہ ہے اور یا اس میں ادل بدل کی ضرورت ہے۔ چنانچہ عجمی اقوام کے میل جول سے جب خرید و فروخت کی نئی نئی صورتیں سامنے آئیں تو حضرت عمرؓ نے ربا اور سود کی تصریحات کو ناکافی اور غیر حاوی خیال کیا۔ اراضی سواد پر جب مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو اکثریت کا یہ بجا مطالبہ تھا کہ ان کو غنائم سمجھ کر تقسیم کیا جائے۔ مگر حضرت عمرؓ ان معنوں میں ان اراضی کو غنیمت نہیں تسلیم کرتے تھے۔ اس لئے انکی تقسیم پر راضی نہ ہوئے۔ اسی طرح صدقات میں ایک حصہ مولفۃ القلوب کا قرآن نے مقرر کیا تھا۔ لیکن یہ اس وقت کی بات تھی جب اسلام حد درجہ کمزور تھا اور اسلامی دعوت اپنے ابتدائی مراحل میں تھی اور اس کو غیر مسلموں میں بھی ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو معاند نہ ہوں۔ لیکن جب فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا، اور اسلام کی دعوت دنیا کے کناروں تک پہنچی تو اس چیز کی حاجت نہ رہی۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے اعلان فرما دیا کہ اب جبکہ ہدایت و رشد کے خطوط گمراہی اور ضلال سے ممیز ہو چکے ہیں۔ ہم تالیف قلب کی منت پذیریوں سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔